رسوا:۔ یہ تصوف ہے، ہم دنیا کے لوگ ہیں، ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں، مگر شوق اظہار، یہ لفظیں کیونکر مل جایا کرتی ہیں؟

امراؤ:۔ مقطع سنئے۔

ہجر میں نالہ و فریاد سے باز آ
ایسی باتوں سے وہ بے درد خفا ہوتا ہے

رسوا:۔ مطلع سے مقطع نکال لیا ہے، مقطع کہنے کی فرصت نہ ملی ہو گی۔

امراؤ:۔ فرصت انہیں کب ملتی ہے۔

پہلے مجرے کے دوسرے دن شام کو بوا حسینی میرے کمرے میں آئیں، ایک خدمت گار ان کے ساتھ تھا۔

بوا حسینی:۔ دیکھو امراؤ صاحب! یہ کیا کہتا ہے۔

اتنا کہہ کے بوا حسینی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

خدمت گار:۔ (سلام کر کے) مجھے نواب سلطان صاحب نے بھیجا ہے، جو کل شب کو محفل میں زرد مندیل سر پر رکھے دولہا کے داہنی طرف بیٹھے تھے۔ اور فرمایا ہے کہ میں کسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ جس وقت میں آؤں، اس وقت کوئی اور نہ ہو۔ اور اس غزل کی نقل مانگی ہے جو آپ نے کل گائی تھی۔

میں:۔ نواب صاحب کو میری تسلیمات کہنا۔ شام کو جب چاہئے، تشریف لائیے، تخلیہ ہو جائے گا۔ غزل کے لئے کل دن کو کسی وقت آنا، لکھ دوں گی۔

دوسرے دن پہر دن چڑھے خدمت گار آیا۔ میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ غزل کی نقل میں نے کر رکھی تھی، تخلیہ اس کے حوالے کی۔ اس نے پانچ اشرفیاں کمر سے نکال کے مجھے دیں اور کہا کہ نواب صاحب نے کہا ہے کہ آپ کے لائق تو نہیں مگر خیر پان کھانے کے لئے میری طرف سے قبول کیجئے۔ آج شب کو چراغ جلنے کے بعد میں ضرور آؤں گا۔ خدمت گار سلام کر کے رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ بوا حسینی کو بلا کے یہ اشرفیاں دے دوں، وہ خانم کے حوالے کریں۔ پھر ایک دفعہ جو اشرفیوں کی طرف دیکھا، چمکتی چمکتی نئے گھن کی اشرفیاں بھلا میرے دل سے کب نکلتی تھیں! اس وقت صندوقچہ دندوقچہ تو میرے پاس نہ تھا، پلنگ کے پائے کے نیچے

دبادیں۔

مرزا رسوا صاحب! میرے نزدیک ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانہ آتا ہے جب وہ چاہتی ہے کہ اسے کوئی چاہے۔ یہ نہ سمجھیئے گا کہ یہ خواہش چند روزہ ہوتی ہے، بلکہ عنفوان شباب سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور سن کے ساتھ ہی اس کا نشو ونما ہوتا رہتا ہے۔ جس قدر سن بڑھتا ہے اسی قدر یہ خواہش بڑھتی رہتی ہے۔

گوہر مرزا بے شک میرا چاہنے والا موجود تھا مگر اس کی چاہت اور قسم کی تھی۔ اس کی چاہت میں ایک بات کی کمی تھی جسے میرا دل ڈھونڈتا تھا۔ مردانہ ہمت کو اس کی طینت میں لگاؤ نہ تھا۔ ماں کا ڈومنی پنا اس کے خمیر میں داخل تھا۔ وہ جو کچھ پاتا تھا مجھ سے چھین جھپٹ کے لے لیتا تھا۔ خود ایک روپے کے سوا، جس کا ذکر کر چکی ہوں، کبھی کچھ نہیں دیا۔ اب میرا دل ایسا عاشق ڈھونڈتا تھا جو میری ناز برداری کرے، روپیہ خرچے، کھلائے پلائے۔ نواب سلطان صاحب (نواب صاحب کا یہی نام آدمی نے بتایا تھا) صورت شکل کے اچھے تھے۔ ان کے چہرے پر اس قسم کا رعب تھا جس پر عورت ہزار دل سے فریفتہ ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کو صرف خوشامد اور اظہار عشق پسند ہے۔ بیشک پسند ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں ذرا بھی کمینہ پن نہ ہو۔ جو لوگ رنڈیوں کا گہنا تاکتے ہوئے آتے ہیں، جن کے ہر کنائے سے یہ مدعا نکلتا ہے کہ ہمیں چاہو، خدا کے لئے چاہو، اور ہمارے گھر پڑ جاؤ۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے، ہمیں دے دو اور ہمارے گھر کی ماما گیری کرو، روٹیاں پکا پکا کے کھلاؤ، ہماری اور ہمارے بال بچوں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ ہر شخص کا حسن حضرت یوسف کا معجزہ نہیں ہے کہ ہر ایک عورت اس پر جان دینے لگے۔ مرد عورت سے اور عورت مرد سے محبت کرتی ہے، مگر اس محبت میں اکثر اغراض ذاتی کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ بے غرض محبت جیسے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یہ صرف قصے کہانیوں میں سنی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یکطرفہ محبت نہیں ہوتی۔ ہم نے اسے بھی آنکھوں سے دیکھا ہے، مگر اس کو خلل دماغ سمجھنا چاہیے۔ پھر کیا ضروری ہے کہ مرد عورت دونوں دیوانے ہوں۔

دوسرے دن شب کو نواب صاحب تشریف لائے۔ بوا حسینی سے معمولی گفتگو کے بعد تعین اخراجات ہو کر کمرے میں تخلیہ ہو گیا۔ معلوم ہوا نواب صاحب نے ملازم نہیں رکھا صرف یہ طے ہوا ہے کہ کبھی رات کو گھڑی دو گھڑی کے لئے آیا کریں گے۔ نواب صاحب بہت ہی کم سخن بھولے آدمی تھے۔ سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پائی تھی۔ ماں باپ کے دباؤ میں

تھے۔ دنیا کے جعل فریب سے بالکل آگاہ نہ تھے۔ اظہار عشق خدمت گار کی زبانی ہو چکا تھا۔ ورنہ نواب صاحب کو اس میں بھی کسی قدر مشکل ہوتی، مگر میں نے تھوڑی دیر میں بے تکلف بنالیا۔

بہت سی لگاوٹ کی باتیں کیں، بالکل عاشق زار بن گئی۔ اس میں کچھ سچ تھا، کچھ جھوٹ۔ سچ تو اس لئے تھا کہ نواب صاحب کی صورت ایسی نہ تھی کہ ایک عورت خواہ وہ کیسی ہی سخت دل کیوں نہ ہو ان پر مائل نہ ہو جائے۔ گوری گوری رنگت جیسے گلاب کا پھول، سوتواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، خوبصورت بتیسی، گھونگر والے بال، کتابی چہرہ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں، بھرے بھرے بازو، مچھلیاں پڑی ہوئی چوڑی کلائیاں، بلند بالا کسرتی بدن، خدا نے سر سے لے کے پاؤں تک تمام بدن نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس پر بھولی بھالی باتیں، بات بات میں عاشقانہ شعر جن میں سے اکثر انہی کی تصنیف تھے۔ شعر پڑھنے میں ہواؤ ٹوٹا ہوا تھا۔ خاندانی شاعر تھے۔ مشاعروں میں اپنے والد کے ساتھ غزل پڑھتے تھے۔ شاعروں کو کیسا ہی عاشقانہ شعر ہو، کسی کے سامنے پڑھتے ہوئے جھینپ نہیں ہوتی۔ خورد بزرگ کے سامنے چاہے اور قسم کی گفتگو نہ کر سکتے ہوں، مگر شعر پڑھنے میں تکلف نہیں ہوتا۔ شعر بھی ایسے کہ اگر نثر میں ان کا مطلب ادا کیا جائے تو منہ سے کہتے نہ بنے۔ غرضیکہ اس شب کو بڑے مزے کی صحبت تھی۔

نواب:۔ آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کر لیا ہے کہ بغیر آپ کے دیکھے چین ہی نہیں آتا۔

میں:۔ یہ سب آپ کی قدر دانی ہے، ورنہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔

"ایاز قدر خود بشناس۔ من آنم کہ من دانم"

نواب:۔ اوہو! آپ تو خواندہ معلوم ہوتی ہیں۔

میں:۔ جی ہاں، کچھ شد بد پڑھا تو ہے۔

نواب:۔ اور لکھنا بھی جانتی ہو؟

میں:۔ جی ہاں لکھ بھی لیتی ہوں۔

نواب:۔ تو وہ غزل آپ ہی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہے؟

میں مسکرا کے چپ ہو رہی۔

نواب:۔ واللہ کیا پیارا خط ہے! اس بات سے تو بہت ہی جی خوش ہوا۔ خدمت گاروں سے دل کا حال کہتے نہیں بنتا، اب زبان قلم سے گفتگو ہوا کرے گی۔ ہم تو ایسا چاہتے ہی تھے، جہاں تک ہو کسی ایسے معاملے میں غیر کی وساطت نہ ہو۔

kitaabiyat.pk

نہ غیروں کی وساطت ہو، نہ یاروں کی شماعت ہو
جو ہیں آپس کی باتیں راز دار ان کے ہمیں تم ہو

میں:- یہ آپ ہی کا شعر ہے؟

نواب:- جی نہیں، والد مرحوم نے فرمایا ہے۔

میں:- کیا خوب فرمایا ہے!

نواب:- ماشاءاللہ آپ کو شاعری کا مذاق بھی ہے۔

اچھی صورت جو خدا دے تو یہ اوصاف بھی دے
حسن تقریر بھی ہو، خوبی تحریر بھی ہو

میں:- کس کا شعر ہے؟

نواب:- ان ہی کا۔

میں:- کیا خوب فرمایا!

نواب:- جی ہاں وہ ایسا ہی فرماتے تھے، مگر واللہ آپ کی شان کے لائق ہے۔

میں:- یہ فقط آپ کی عنایت ہے۔

ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

نواب:- واہ کیا صاف صاف شعر ہے!

میں:- تسلیم!

نواب:- یہ کہئے آپ شعر بھی کہتی ہیں۔

میں:- جی نہیں، آپ ایسے قدردانوں سے کہوا لیتی ہوں۔ اس بات پر نواب صاحب پہلے تو اک ذرا چیں بہ جبیں ہوئے، پھر مسکراتے ہوئے دیکھ کر ہنس پڑے۔

نواب:- خوب کہی! جی ہاں اکثر رنڈیوں کا دستور ہے کہ یاروں سے شعر کہوا کے اپنے نام سے پڑھا کرتی ہیں۔

میں:- آپ رنڈیوں کو کہئے۔ کیا مرد ایسا نہیں کرتے؟

نواب:- واللہ سچ ہے۔ والد مرحوم کے دوستوں میں اکثر ایسے صاحب ہیں جنہوں نے کبھی ایک مصرع نہیں کہا اور ہر مشاعرے میں غزل پڑھنے کو مستعد۔ اکثر والد ہی کہہ دیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میری غزل میں شعر زائد ہوئے، چھانٹ دیئے۔ میں کہتا ہوں

کہ اس میں لطف ہی کیا ہے۔ والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے حضرت استاد کے بنائے ہوئے شعر دیوان سے نکال ڈالے۔ جھوٹی تعریفوں سے دل کو کیا خوشی ہوتی ہو گی۔

میں:۔ خدا جانے۔ یہ بھی ایک ہوس ہے اور بڑی ہوس۔

نواب:۔ اچھا تو اس غزل کا اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھیے۔

میں:۔ فرض ہے ضبط نالہ و فریاد
جس سے ناخوش ہو تم وہ عادت کیا

نواب:۔ کیا شعر ہے! پھر پڑھیے۔ واللہ کیا نئی بات کہی ہے!

میں:۔ (شعر دوبارہ پڑھ کے) تسلیم! آپ قدردانی کرتے ہیں۔

نواب:۔ شعر ہی اچھا ہے۔ اور کوئی شعر پڑھیے۔

میں:۔ اس طرح میں میری غزل نہیں۔ یہ دو شعر ابھی کہے ہیں۔

نواب:۔ یہ اور طرہ ہوا۔ فی البدیہہ اور ایسے شعر! اچھا اور کسی غزل کے شعر پڑھیے۔

میں:۔ اب آپ ارشاد کیجیے۔ اسی لئے میں نے سبقت کی تھی۔

نواب:۔ میں پڑھے دیتا ہوں، مگر آپ کو بھی غزل پڑھنا ہو گی۔

اتنے میں کمرے کا دروازہ دھڑاک سے کھلا اور ایک صاحب پچاس پچپن برس کا سن، سیاہ رنگت، کرخت داڑھی، ترچھی پگڑی باندھے، کمر بندھی ہوئی، کٹار لگی ہوئی، کمرے کے اندر گھس آئے اور آتے ہی نہایت بے تکلفی سے میرا زانو دبا کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے میری طرف دیکھا، میں نے سر جھکا لیا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کہاں تو نواب سے یہ اقرار تھا کہ بالکل تخلیہ ہو گا، کمرے میں کوئی نہ ہو گا۔ کس مزے کی گفتگو، کیسا ستھرا مذاق تھا، کیا راز و نیاز ہو رہا تھا، کہاں یہ بلائے مہیب نازل ہوئی۔ سنگ آمد و سخت آمد۔

ان صاحب نے بیٹھتے ہی نواب صاحب کی طرف گھور گھور کے دیکھنا شروع کیا جیسے کوئی اپنے باپ کے قاتل کو دیکھتا ہو۔ گھڑی گھڑی کٹار پر ہاتھ جاتا تھا۔ میں تو دل میں سہمی جاتی تھی۔ یا الٰہی یہ کیا آفت ناگہانی آ گئی۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ نواب اپنی طرف کھنچے ہوئے بیٹھے ہیں، تیوریاں چڑھی ہوئی ہیں۔

ہائے کیا مزے کی صحبت تھی، اس کم بخت نے کیسا خلل ڈالا۔ نواب ابھی غزل پڑھنے کو تھے،

اس کے بعد میں کچھ کہتی۔ نواب تعریفیں کرتے کیا دل خوش ہوتا۔ آج ہی تو ایک ایسا قدر دان ملا تھا جسے مدتوں سے میرا دل ڈھونڈتا تھا اور آج ہی آفت کا سامنا ہوا۔ خدا اس موئے کو جلدی یہاں سے اڑائے۔ یہ خیالات میرے دل میں تھے اور وہ خون خوار صورت آنکھوں کے سامنے تھی جس کے دیکھنے سے میرا دل لرزا جاتا تھا۔ یہ تو میری جان کو گویا دلاور خان ہو گیا۔ بار بار اندیشہ تھا کہ کٹار جو اس کی کمر میں ہے یا میرے کلیجے کے پار ہو گی یا خدانخواستہ نواب کو کچھ گزند پہنچائے گی۔ دل ہی دل میں کوستی تھی، خدا غارت کرے، موا کہاں سے اس وقت آ گیا۔

آخر مجھ سے اور تو کچھ نہ بن پڑا، بوا حسینی کو آواز دی۔ انہوں نے آ کے جو یہ ماجرا دیکھا، سمجھ گئیں۔ بوا حسینی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ ان صاحب کو کچھ جانتی بھی تھیں۔

بوا حسینی:۔ خان صاحب! مجھے کچھ آپ سے عرض کرنا ہے، ادھر تشریف لائیے۔

خان صاحب:۔ جو کچھ کہنا ہے وہیں سے کہو۔ ہم لوگ کہیں بیٹھ کے اٹھتے نہیں۔

بوا حسینی:۔ تو خان صاحب کوئی زبردستی ہے؟

خان صاحب:۔ اس میں زبردستی کیا۔ رنڈی کے مکان پر کسی کا اجارہ نہیں، اور اگر زبردستی ہے تو زبردستی ہی سہی۔ ہم تو نہیں اٹھنے کے۔ دیکھیں تو ہمیں کون ۔۔۔۔ اٹھا دیتا ہے۔

بوا حسینی:۔ اجارہ کیوں نہیں۔ جو زر خرچے گا، رنڈی اسی کی ہے۔ پھر اور کوئی اس وقت نہیں آ سکتا۔

خان صاحب:۔ تو کیا زر خرچنے کو ہم نابر ہیں؟

بوا حسینی:۔ اچھا اس وقت اس کا کوئی موقع نہیں۔ اور کسی وقت تشریف لائیے گا۔

خان صاحب:۔ عورت کچھ واہی ہوئی ہے۔ کہہ دیا ہم نہیں اٹھیں گے۔

میں نے دیکھا کہ نواب کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا، مگر ابھی تک چپکے بیٹھے ہیں، کچھ منہ سے نہیں بولتے۔

بوا حسینی:۔ بیٹی اچھا تو ادھر اٹھ کے چلی آ۔ نواب صاحب! آپ کے آرام کا وقت ہے۔ کوٹھے پر تشریف لے جائیے۔

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس نگوڑ مارے نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب کیا کروں!

نواب:۔ خان صاحب! رنڈی کا ہاتھ چھوڑ دیجئے، اسی میں خیریت ہے۔ بہت کچھ زیادتیاں کر چکے ہیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا، صرف اس خیال سے کہ رنڈی کے مکان پر تہتک کرنا

اچھا نہیں، مگر اب۔۔۔۔۔

خان صاحب:۔ مگر اب تم کیا کر سکتے ہو۔ دیکھیں تو کون..... رنڈی کا ہاتھ چھڑواتا ہے۔

میں:۔ (زور سے ہاتھ جھٹک کر) اچھا تو ہاتھ چھوڑ دیجئے، میں کہیں جاتی نہیں۔ (واقعی میں نواب صاحب کو چھوڑ کے ہرگز نہ جاتی)۔

خان صاحب نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

نواب:۔ میں کہے جاتا ہوں کہ ذرا زبان سنبھال کے گفتگو کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شریفوں کی صحبت نہیں اٹھائی۔

خان صاحب:۔ خیر تم نے تو شریفوں کی صحبت اٹھائی ہے، جو کچھ ہو سکے کر لو۔

نواب:۔ یہ تو معلوم ہوا کہ آپ لڑنے پر آمادہ ہیں، مگر رنڈی کا مکان کوئی اکھاڑا نہیں ہے، نہ میدان۔ بہتر ہے اس کو کسی اور وقت پر موقوف رکھئے اور اب تشریف لے جائیے۔ نہیں تو۔۔۔۔۔

خان صاحب:۔ نہیں تو تم مجھے گھول کر پی جاؤ گے؟ تشریف لے جائیے کی خوب کہی، تم ہی کیوں نہیں چلے جاتے؟

نواب:۔ خان صاحب! جناب امیر کی قسم! میں بہت طرح دیتا ہوں، اس لئے کہ مجھے کسی قدر اپنی عزت کا خیال ہے۔ والدین، عزیز، دوست، جو سنے گا نام رکھے گا، ورنہ آپ کو ابھی ان گستاخیوں کا مزا چکھا دیتا۔ پھر میں آپ سے کہتا ہوں کہ بے فائدہ حجت نہ کیجئے، تشریف لے جائیے۔

خان صاحب:۔ رنڈی کے گھر پر تو آتے ہو اور اماں جان سے ڈرتے ہو؟ گستاخیاں کیسی؟ تمہارے باپ کا نوکر ہوں؟ تم اپنے گھر کے رئیس زادے ہو تو ہوا کرو۔ رنڈی کے مکان پر تم بیٹھے ہو، ہم بھی بیٹھے ہیں۔ جب ہمارا جی چاہے گا، جائیں گے۔ تم خود بے کار حجت کرتے ہو۔ کسی کو اٹھاتے نہیں دیکھا۔

نواب:۔ اٹھا دینا تو کوئی مشکل کام نہیں۔ خدمت گاروں کو آواز دیتا ہوں تو آپ کی گردن میں ہاتھ دے کے ابھی نکالے دیتے ہیں۔

خان صاحب:۔ خدمت گاروں کے بل پر نہ بھولنا، یہ کٹار بھی دیکھا ہے؟

نواب:۔ ایسے بہت کٹار دیکھے ہیں۔ جو وقت پر کام آوے وہ کٹار ہے۔ آپ کی کٹار میان سے

نکلتی رہے گی، یہاں تو ابھی آپ کی گردن ناپ دی جائے گی۔ پھر دیکھا جائے گا۔

خان صاحب:۔ لے اب تم گھر کو جاؤ، اماں جان یاد کرتی ہوں گی۔

میں دیکھ رہی تھی کہ نواب صاحب کا چہرہ بالکل متغیر ہو گیا ہے۔ مارے غصے کے تھر تھر کانپ رہے تھے، مگر واہ ری شرافت! اس پاجی نے کس قدر سخت سست کہا، مگر یہ آپ ہی آپ کر کے بات کر رہے ہیں۔ اس سے مجھے پہلے تو یہ خیال تھا کہ نواب ڈر گئے، مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ واقعی نواب کو اپنی عزت کا خیال تھا، اسی لئے طرح دے رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ معاملہ سہولت سے رفع دفع ہو جائے، مگر اس پاجی کی بد زبانی بڑھتی جاتی تھی۔ جس قدر نواب طرح دیتے تھے، وہ اور شیر ہوا جاتا تھا۔ آخر نواب نے کہا۔

نواب:۔ اچھا اٹھئے خان صاحب! ہم آپ دونوں یہاں سے چلے چلیں، عیش باغ میں چل کے ہمارے آپ کے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔

خان صاحب:۔ (قہقہہ مار کے) صاحب زادے! ابھی تم خود منہ چومنے کے لائق ہو اور مردوں سے پنجہ جنگی کرنے کا حوصلہ! کہیں کوئی چرکا کھا جاؤ گے تو اماں جان روتی پھریں گی۔

نواب:۔ مردود! اب تیری بد زبانیاں حد کو پہنچ گئی ہیں۔ دیکھ اب تجھے تیری گستاخی کی سزا دیتا ہوں۔

یہ کہتے ہی نواب نے دوشالے کے اندر سے ہاتھ نکالا۔ ہاتھ میں طمنچہ تھا، دن سے داغ دیا۔ خان صاحب دھم سے گر پڑے، میں سن سی ہو گئی۔ فرش پر خون ہی خون نظر آتا تھا۔ بوا حسینی جہاں کھڑی تھیں کھڑی رہ گئیں۔ طمنچے کی آواز سن کے خانم صاحب، مرزا صاحب، میر صاحب، خورشید جان، امیر جان، بسم اللہ جان، خدمت گار، مہریاں، تو، میں سب دوڑے آئے۔ میرے کمرے میں بھیڑ ہو گئی۔ سب اپنی اپنی کہنے لگے۔ اتنے میں شمشیر خاں (ایک ادھیڑ سا آدمی، نواب صاحب کا ملازم) نے لپک کر نواب کے ہاتھ سے طمنچہ لیا اور کہا "لے اب حضور گھر تشریف لے جائیں، میں سمجھ لوں گا۔"

نواب:۔ میں نہیں جاتا۔ اب جو کچھ ہوا، ہوا، اور جو کچھ ہونا ہو گا، ہو جائے گا۔

شمشیر خاں:۔ (کمر سے چھری نکال کے) جناب امیر علیہ السلام کی قسم! ابھی اپنے کلیجے میں مار لوں گا، نہیں تو برائے خدا آپ چلے جائیں۔ آپ کا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے۔

اتنے میں لوگوں نے دیکھا خان صاحب کے گولی کہاں لگی۔ معلوم ہوا کہ جان کی خیریت ہے، بازو میں لگی تھی، اس پار ہو گئی۔

شمشیر خاں:۔ میں عرض کرتا ہوں کہ حضور تشریف لے جائیں۔ اس مردود کا ہوا ہی کیا ہے۔ آپ کیوں بدنام ہوتے ہیں۔

بارے نواب صاحب بھی کچھ سمجھ کے اٹھے۔ ایک آدمی ہمارے یہاں سے ساتھ کیا گیا۔ خانم نے اسی وقت مرزا علی رضا بیگ کو بلوا بھیجا۔ وہ چوک میں ہی تھے۔ فوراً چلے آئے۔ خانم نے علیحدہ لے جا کر نہیں معلوم کیا کان میں پھونکا، وہاں سے آئے تو یہ کہتے ہوئے آئے۔

مرزا:۔ ہو گا! پھینک دو مردود کو کمرے کے نیچے، سمجھ لیا جائے گا۔

خیر، خان صاحب کو کمرے کے نیچے تو نہیں پھینکا، بازو پر پٹی باندھی، ڈولی بلوائی گئی۔ خان صاحب کو بھی کسی قدر ہوش آگیا تھا۔ مکان کا پتا پوچھا، معلوم ہوا مرغ خانے میں رہتے ہیں۔ ڈولی میں بٹھا کے ان کے گھر بھجوا دیا۔ کہاروں کو سمجھا دیا تھا مکان کے قریب کہیں پر اتار کے چلے آنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سلطان صاحب کئی دن تک نہیں آئے، نہ ان کا آدمی آیا۔ مجھے ان سے محبت سی ہو گئی تھی۔ یقین تھا کہ وہ اب نہیں آئیں گے اور واقعی ایسا ہی ہوا بھی۔ وضع دار آدمی تھے، پہلے ہی جب وہ آئے تھے، آدمی کی زبانی پیش تر بہت تاکید تخلئے کے لئے کر دی تھی۔ بوا حسینی نے اقرار کر لیا تھا کہ کوئی نہ آنے پائے گا۔ مگر اتنی چوک ہو گئی کہ دروازے پر کسی کو نہ بٹھا دیا۔ خان صاحب از غیبی ڈھیلا خدا جانے کہاں سے آن پڑے، سارا کھیل بگڑ گیا۔ اتفاق سے چار پانچ دن کے بعد ایک برات میں میرا مجرا آگیا تھا۔ وہاں نواب صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ میرا پہلا مجرا نو بجے رات کو شروع ہونا تھا۔ محفل میں بات کرنا کیسا، اشارے کنائے کا بھی موقع نہ تھا۔ ایک لڑکا گورا گورا، کوئی نو دس برس کا سن، بھاری کپڑے پہنے سلطان صاحب کے پاس بیٹھا تھا، کسی ضرورت سے اٹھا۔ میرا مجرا ہو چکا تھا، علیحدہ کمرے میں پیشواز اتار رہی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے بلوایا، پاس بٹھایا، ایک پان لگا کے دیا، پوچھا۔

میں:۔ سلطان صاحب کو جانتے ہو؟

لڑکا:۔ کون سلطان صاحب؟

میں:۔ وہ جو دلہا کے پاس تمہارے برابر بیٹھے تھے۔

لڑکا:۔ (تیوری چڑھا کے) واہ! وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں، انہیں ذرا سلطان صاحب نہ کہنا۔

میں:۔ اچھا تو ہم کچھ دیں، انہیں دو گے؟

لڑکا:۔ کہیں مجھ پر خفا نہ ہوں؟

میں:۔ خفا نہیں ہوں گے۔

لڑکا:۔ اور دد گی کیا، پان؟

میں:۔ پان نہیں، پان تو ان کے خاص دان میں ہوں گے۔ اے لو، یہ کاغذ دے دینا۔

ایک پرچہ کاغذ کا کمرے میں فرش پر پڑا تھا، میں نے اس پر کوئلے سے یہ شعر لکھ دیا۔

مدتوں سے ہم ہیں محرومِ عتاب
بزم میں آج ان کو چھیڑا چاہیئے

اور سمجھا دیا کہ یہ کاغذ ان کی آنکھ بچا کے سامنے رکھ دینا، ان کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ میں کمرے کے پٹ کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ سلطان صاحب نے وہ کاغذ اٹھایا، پڑھا۔ پہلے تو چہرے پر کچھ فکر کے آثار ظاہر ہوئے۔ پھر تھوڑی دیر تک پرچے کو غور سے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد مسکرا کے جیب میں رکھ لیا۔ شمشیر خان کو اشارے سے بلایا، اس کے کان میں کچھ چپکے سے کہا، کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شمشیر خاں ہمارے کمرے میں آیا۔

شمشیر خان:۔ نواب صاحب نے کہا ہے کہ اس پرچے کا جواب ہم گھر پر جا کر لکھ بھیجیں گے۔

دوسرا مجرا صبح کو ہوا تھا، اس وقت سلطان صاحب محفل میں نہ تھے۔ ان کے بغیر محفل مجھے سونی معلوم ہوتی تھی، گانے میں دل نہ لگتا تھا۔ آخر جوں توں مجرا ختم ہوا، میں گھر پر آئی۔ اس دن، دن بھر شمشیر خان کا انتظار رہا۔ بارے چراغ جلنے کے بعد وہ آیا، نواب کا رقعہ دیا۔ مضمون یہ تھا۔

"تمہارے شعر نے اس آگ کو، جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی، کرید کر بھڑکا دیا، واقعی مجھے تم سے محبت ہے، مگر اپنی وضع سے مجبور ہوں۔ تمہارے مکان پر اب ہرگز نہ آؤں گا۔ میرے ایک بے تکلف دوست نواز گنج میں رہتے ہیں، کل میں تمہیں وہاں بلوا بھیجوں گا، بہ شرط فرصت چلی آنا۔ یہی ایک صورت ملنے کی ہے، وہ بھی نو دس بجے رات تک۔

شب وصال کی کوتاہیوں کا شکوہ کیا
یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لالے ہیں

سلطان صاحب اس دن سے کبھی خانم کے مکان پر نہیں آئے۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ وار گنج میں نواب بنے خاں کے مکان پر بلوا بھیجتے تھے۔ عجب لطف کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی شعر و سخن کا چرچا ہوا، کبھی نواب بنے صاحب طبلہ بجانے لگے، میں گانے لگی۔ سلطان صاحب خود بھی گاتے تھے۔ تال سم سے تو ایسے واقف نہ تھے، مگر اپنی غزل آپ خوب گا لیتے تھے۔

کچھ اس طرح سے نظر بازیوں کی مشق بڑھی
میں ان کو اور وہ میری نظر کو دیکھتے ہیں

جب یاد آتا ہے، اس جلسے کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ گرمیوں کے دن، شب مہتاب کا عالم، صحن باغ میں تختوں کے چوکے پر سفید چاندنی کا فرش ہے، گاؤ تکئے لگے ہوئے۔ سامان عیش و نشاط مہیا، باغ میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے، بیلے چنبیلی کی مہک سے دماغ معطر، خوشبو دار گلوریاں، بسے ہوئے حقے، تخلئے کا جلسہ، آپس کی چہلیں، بے تکلفی کی باتیں! ایسے ہی جلسوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کا تو ذکر کیا، انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے اور اسی کی سزا ہے کہ ایسے جلسے بہت جلد برہم ہو جاتے ہیں اور ان کا افسوس مرتے دم تک رہتا ہے، بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی۔

لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے ان سے محبت تھی۔ دونوں کے مذاق کچھ ایسے ملتے ہوئے تھے کہ عمر بھر کا ساتھ ہوتا تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ سلطان صاحب کو شعر و سخن کا شوق تھا اور مجھے بھی بچپن سے اس کی لت ہے۔ سلطان صاحب سے جیسا میرا دل ملا اور کسی سے نہیں ملا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی سبب سے مجھ سے محبت کرتے تھے۔ بات بات میں وہ شعر پڑھتے تھے۔ میں جواب دیتی تھی۔ مگر افسوس! فلک تفرقہ انداز نے وہ جلسہ بہت ہی جلد برہم کر دیا۔

دل یہ کہتا ہے فراق ماہ و انجم دیکھ کر
ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کی برہم ہو گئیں

رسوا۔ اچھا وہ سب کچھ تو ہوا۔ آپ کے قدم کی برکت سے ایسے ایسے بہت سے جلسے برہم ہو گئے ہوں گے۔

امراؤ۔ واہ مرزا صاحب! تو کیا میرے دشمن بھن پیرے ہیں، یہ آپ نے خوب کہی۔

رسوا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا، مگر سلامتی سے یہاں آپ تشریف لے گئیں، صفائی ہو گئی۔

امراؤ۔ آپ جو چاہے کہئے۔ اگر ایسا جانتی کہ آپ یہ کہیں گے تو اپنی روداد ہرگز بیان نہ کرتی۔ خیر اب تو قصور ہوا۔

رسوا۔ قصور! یہی تو آپ نے زندگی بھر میں ایک کام کیا جس سے آپ کا نام دنیا میں رہ

جائے گا۔ خواہ نیک نامی کے ساتھ خواہ بدنامی کے ساتھ۔ اس کا ذمہ میں نہیں کرتا۔ اب اس بات کو یہیں تک رہنے دیجئے۔ ذرا اس غزل کے دو تین شعر اور یاد ہوں تو پڑھ دیجئے۔

امراؤ۔ آپ بھی آدمی کو خوب بناتے ہیں۔

رسوا۔ خیر بگاڑتا تو نہیں؟ اچھا آپ شعر پڑھئے۔

امراؤ۔ اچھا سنئے۔ ایک مطلع اور دو شعر اور یاد ہیں۔

درد دل کی لذتیں صرف شب غم ہو گئیں
طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں
وہ جو بیٹھے سوگ میں زلف رسا کھولے ہوئے
حسرتیں میری شریک بزم ماتم ہو گئیں
ہم نشیں ! دیکھی نحوست داستان ہجر کی
صحبتیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

اسی زمانے میں نواب جعفر علی خان صاحب کی ملازم ہوئی۔ سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا۔ منہ میں ایک دانت نہ تھا، پشت خم ہو گئی تھی۔ سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا، مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے۔ ہائے وہ ان کا کیچلی کا انگرکھا اور گلبدن کا پاجامہ، لال نیفہ، مصالح دار ٹوپی، کاکلیں بٹی ہوئی، عمر بھر نہ بھولیں گی۔

آپ کہئے گا کہ اس عمر اور ایسی حالت میں رنڈی نوکر رکھنا کیا ضرور تھا۔ سنئے مرزا صاحب! اس زمانے کا فیشن یہی تھا۔ کوئی امیر رئیس ایسا بھی ہو گا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔ نواب صاحب کی سرکار میں جہاں اور سامان شان و شوکت کے تھے، وہاں سلامتی منانے کے لئے جلوسیوں میں ایک رنڈی کا بھی اسم تھا۔ پچھتر روپے ماہوار ملتے تھے۔ دو گھنٹے کے لئے مصاحبت کر کے چلی آتی تھی۔ اور تکلف سنئے، نواب بوڑھے ہو گئے تھے، مگر کیا مجال نو بجے کے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں۔ اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی، کھلائی آ کے زبردستی اٹھا لے جاتی تھی۔ نواب صاحب کی والدہ زندہ تھیں، ان سے اسی طرح ڈرتے تھے جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہو۔ بیوی سے بھی انتہا کی محبت تھی۔ بچپن میں شادی ہوئی تھی، مگر سوائے عشرہ محرم اور شبوں کے کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ آپ تو ہنستے ہوں گے۔ مگر میرے دل سے پوچھئے، بیشک پیار کرنے کے قابل تھے۔ اس

بڑھاپے میں جس وقت سوز پڑھتے تھے دل لوٹ جاتا تھا۔ فن موسیقی میں ان کو کمال تھا۔ کیا مجال ان کے سامنے کوئی گا سکے۔ اچھے اچھے گویوں کو ٹوک دیا۔ سوز خوانی میں یکتا تھے، سندی سوز میر علی صاحب کے ان کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کی ملازمت سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سینکڑوں سوز یاد ہو گئے، دور دور میری شہرت ہو گئی۔

خانم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ امام باڑے میں پٹکے، شیشہ، آلات، جوشے تھی، نادر تھی۔ عشرہ محرم میں دس دن تک روز مجلس ہوتی تھی۔ عاشورے کے دن سینکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ شکنی کی جاتی تھی۔ چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔

میری سوز خوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکیبیں اور کسی کو کب یاد تھیں۔ بڑے بڑے سوز خواں میرے سامنے منہ نہ کھول سکتے تھے۔ اسی سوز خوانی کی بدولت نواب ملکہ کشور کے محل تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں پناہ نے خود میری نوحہ خوانی کی تعریف کی۔ سرکار شاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔ مرثیہ خوانوں میں میرا اسم تھا۔ شب کو اپنے امام باڑے میں ماتم کر کے مجھے در دولت پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کوئی دو بجے رات کو وہاں سے آتی تھی۔

جس زمانے میں بسم اللہ کی مسی ہوئی تھی، نواب چھبن صاحب کے چچا کربلائے معلیٰ گئے ہوئے تھے۔ بسم اللہ کی مسی کو کوئی چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ وہ کربلا سے تشریف لائے۔ ان کی لڑکی کی نواب کے ساتھ منگنی ہو گئی تھی، انہوں نے آتے کے ساتھ ہی شادی پر زور دیا۔ نواب صاحب بسم اللہ جان پر مرتے تھے۔ ادھر بسم اللہ جان نے گھر میں بیٹھ جانے کا فقرہ دے رکھا تھا، صاف انکار کر دیا۔ مگر انکار کب چلتا تھا۔ شادی زمانہ، انکی لڑکی پر گالی چڑھ چکی تھی، وہ کب مانتے۔ ایک شب کو نواب کے مکان پر جلسہ ہے۔ مصاحبین جمع ہیں۔ بسم اللہ نواب کے پہلو میں بیٹھی ہیں اس رات کو بسم اللہ کے ساتھ میں بھی چلی گئی تھی۔

سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی ہوں، نواب صاحب طنبورہ چھیڑ رہے ہیں۔ نواب صاحب کے مصاحب خاص دلبر حسین طبلہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک خبردار نے خبر دی کہ بڑے نواب صاحب (نواب صاحب کے چچا) تشریف لاتے ہیں۔ نواب صاحب یہ سمجھے کہ آئے ہیں تو اندر محل میں بیگم صاحب (نواب صاحب کی والدہ) کے پاس جائیں گے۔ ہم سب کو بھی یہی خیال تھا۔ مگر وہ درانا دیوان خانے میں گھسے چلے آئے۔ آ کے جو دیکھا تو یہ جلسہ ہے۔ آگ بگولا ہو گئے۔ خیر ان کے آنے کے ساتھ ہی گانا تو موقوف ہوا، نواب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

بڑے نواب:۔ خیر اب تعظیم و تکریم کو تو رہنے دیجئے، مجھے ایک امر ضروری عرض کرنا تھا، ورنہ آپ کے عیش میں خلل انداز نہ ہوتا۔

نواب:۔ ارشاد!

بڑے نواب:۔ آپ بچے ہیں، آپ کو معلوم نہیں میرے چھوٹے بھائی احمد علی خان مرحوم نے والدہ مرحومہ کے سامنے انتقال کیا تھا، اس وجہ سے آپ محجوب الارث ہیں۔ کوئی حق آپ کا اس جائیداد میں نہیں ہے جس پر آپ قابض و متصرف ہیں۔ بیشک والدہ مرحومہ نے آپ کو بیٹا کیا تھا اور مرتے وقت آپ کے نام وصیت بھی کر گئی ہیں، مگر وہ کوئی چیز نہیں۔ صرف ایک ثلث جائیداد بنا بر اس وصیت نامے کے آپ کو مل سکتی ہے، مگر لوگوں کے کہنے سننے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ثلث سے زیادہ صرف کر چکے ہیں۔ خیر ثلث کا مجھ کو دعویٰ نہیں اور ثلث سے زیادہ کی نسبت آپ سے باز پرس نہ کی جائے گی اس لئے کہ آپ میرے خون جگر ہیں۔ (اس کے بعد بڑے نواب صاحب آب دیدہ ہو گئے، مگر پھر ضبط کر کے کہا) آپ اس جائیداد پر مدت العمر قابض و متصرف رہتے، میری ذاتی جائیداد میرے خرچ کے لئے کفالت کرتی ہے اور اس جائیداد کے بھی آپ ہی وارث ہوتے۔ مگر آپ کی بد وضعی نے مجھے مجبور کیا کہ آپ کو اس جائیداد موروثی سے بے دخل کر دوں۔ بزرگوں کی نیک کمائی حرام کاری میں مٹانے کے لئے نہیں ہے۔ منصف الدولہ کے آدمی میرے ہم راہ ہیں، اسی وقت تمام گھر کا تعلیقہ ہو گا۔ آپ فوراً مع ارباب نشاط یہاں سے تشریف لے جایئے۔

نواب:۔ تو اس جائیداد میں میرا کوئی حق نہیں؟

بڑے نواب:۔ جی نہیں۔

نواب:۔ اچھا، ایک ثلث پانے کا مستحق ہوں؟

بڑے نواب:۔ وہ آپ لے چکے۔ اور اگر آپ کو کچھ دعویٰ ہے تو در دولت پر تشریف لے چلئے۔ میرے نزدیک آپ کا ایک حبہ نہیں۔

نواب:۔ تو اچھا اماں جان کو میں اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔

بڑے نواب:۔ وہ آپ سے دست بردار ہوتی ہیں۔ وہ میرے ساتھ کربلا جائیں گی۔

نواب:۔ اچھا تو میں کہاں جاؤں؟

بڑے نواب:۔ یہ میں کیا جانوں! یہ اپنے مصاحبین اور ملازمین مشغولہ اور معشوقہ سے دریافت کیجئے۔

نواب:۔ اچھا تو میرے کپڑے، اسباب وغیرہ تو دے دیجئے۔

بڑے نواب:۔ اس مکان میں آپ کا کوئی اسباب نہیں ہے۔ نہ آپ کے ذاتی بنوائے ہوئے کپڑے ہیں۔

اس کے بعد منصف الدولہ کے آدمی دیوان خانے میں آئے، نواب صاحب کو مع مصاحبین و ارباب نشاط گھر سے باہر کیا۔

ہم لوگوں نے گھر سے نکلتے ہی ڈولیاں کرایہ کیں، چوک کا راستہ لیا، مصاحبین اور نواب صاحب خدا جانے کہاں گئے۔

سنا ہے کہ مصاحبین ایک ایک کر کے راستے ہی سے رخصت ہو گئے۔ نواب کے والد کا ایک قدیم ملازم مخدوم بخش جس کو نواب صاحب نے بیکار سمجھ کر نوکری سے برطرف کر دیا تھا، راستے میں ملا۔ اس نے حال دریافت کیا اور ان کی بے کسی پر ترس کھا کے اپنے گھر لے آیا۔

نواب صاحب کے گھر سے آنے کے بعد بسم اللہ کے کمرے میں جلسہ ہے۔ میاں حسنو، نواب صاحب کے خاص کارکن، مصاحب، دوست، جاں نثار، جہاں نواب کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے والے، تشریف رکھتے ہیں۔ یہ آج ہی کچھ نہیں آئے ہیں، پہلے بھی نواب کے چوری چھپے آیا کرتے تھے، مگر آج کھلے خزانے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھے ہیں۔ اس وقت آپ بسم اللہ جان پر گویا بے شرکت الغیرے و بے مزاحمت غیرے قابض و متصرف ہیں۔ نوکری کی گفتگو ہو رہی ہے۔

حسنو:۔ دیکھو بسم اللہ جان! ۔۔۔۔۔ نواب سے تو اب سے کوئی امید نہ رکھو۔ میں، جو کچھ کہو، وہ دے دیا کروں، غریب آدمی ہوں، زیادہ تو میری اوقات نہیں۔ جو نواب صاحب دیتے تھے، اس کا نصف بھی مجھ سے ممکن نہیں، مگر ہاں کسی نہ کسی طرح آپ کو خوش رکھوں گا۔

بسم اللہ:۔ غریب آدمی ہوں؟ یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کاٹ کاٹ کے گھر میں بھر لی اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ ایسے غریبوں کو تاؤ تو نو من چربی سے کم نہ نکلے۔

حسنو:۔ ہیں ہیں! تم تو ایسا نہ کہو۔ وہ نواب کے پاس تھا ہی کیا جو میں گھر بھر لیتا۔ کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا؟

بسم اللہ:۔ آپ کی والدہ بوا فرخندہ نواب سرفراز محل کی خاصہ والیوں میں تھیں نا؟

میر حسنو:۔ (جھینپ کر) وہ جو کوئی ہوں، جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا تو زیور چھوڑ کر مری ہیں۔

بسم اللہ:۔ وہ آپ کی بیوی لے کے یار کے ساتھ نکل گئیں، آپ کے پلے کیا پڑا؟ میرے آگے ذرا شیخی نہ بگھارئیے، مجھے رتی رتی آپ کا حال معلوم ہے۔

حسنو:۔ تو والد کے پاس کچھ کم تھا؟

بسم اللہ:۔ والد آپ کے نواب حسن علی خان کے چڑی ماروں میں تھے۔

حسنو:۔ چڑی ماروں میں؟

بسم اللہ:۔ اچھا وہ مرغ بازوں میں سہی۔

حسنو:۔ مرغ بازوں میں تھے؟

بسم اللہ:۔ اچھا وہ بٹیر باز سہی، تھا تو چڑیا کا کام۔

حسنو:۔ لیجئے آپ تو مذاق کرتی ہیں۔

بسم اللہ:۔ میں کھری کہتی ہوں، اسی سے بری مشہور ہوں۔ اور کہتی بھی نہ، تمہارے چھچھورے پن پر جی جل گیا۔ یوں تم آتے تھے، میں نے کبھی منع نہیں کیا۔ آج ہی تو نواب پر یہ واردات ہوئی، آج ہی آپ نے میرے منہ در منہ نوکری کا پیغام دے دیا۔ ہوش کی دوا کرو۔ تم کیا نوکر رکھو گے۔ یہی ایک مہینہ، دو مہینہ، تین مہینہ سہی، بس!

حسنو:۔ چھ مہینے کی تنخواہ جمع کر دوں؟

بسم اللہ:۔ زبان سے؟

حسنو:۔ یہ لو (سونے کے جڑاؤ کڑے کی جوڑی کمر سے نکال کے) تمہارے نزدیک کتنے کا مال ہو گا؟

بسم اللہ:۔ میں دیکھوں؟ (کڑے حسنو کے ہاتھ سے لے کے اپنے ہاتھوں میں پہن لئے) کل چھتا مل کے لڑکے کو دکھاؤں گی، مگر ہے اچھے ہیں۔ اچھا تو اب آپ تشریف لے جایئے۔ اس وقت تو مجھے چھٹن باجی نے بلا بھیجا ہے، ٹھہر نہیں سکتی، کل اسی وقت آیئے۔

حسنو:۔ تو کڑے اتار دیجئے۔

بسم اللہ:۔ یا اللہ! کوئی چوروں سے بہوار ہے؟ میں تمہارے کڑے کچھ کھا نہ لوں گی۔ اس وقت میرے ہاتھ میں سادی پٹریاں پڑی ہوئی ہیں۔ اماں جان سے چھپ کے جاتی ہوں، ان

سے کڑے مانگوں گی تو کہیں گی کیا کرو گی، اس لئے ذرا ہاتھ میں ڈال لئے، صبح کو لے جانا۔

حسنو:۔ کڑے دے دیجئے، میرے نہیں ہیں، نہیں تو کیا بات تھی، تم پر سے صدقے کئے تھے۔

بسم اللہ:۔ تو کیا آپ کی اماں کے ہیں؟ انہوں نے انتقال کیا، پھر بھی آپ کا مال ہے۔

حسنو:۔ میں نے یوں ہی تمہیں دکھا دیئے تھے، میرا مال نہیں ہے۔

بسم اللہ:۔ جیسے میں پہچانتی نہیں۔ یہ وہی کڑے ہیں جو نواب نے اس دن میرے سامنے گروی رکھنے کو دیئے تھے۔

حسنو:۔ لو اور سنو! یہ کب؟

بسم اللہ:۔ یہ جب کہ جس دن بہن امراؤ کے مجرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ بہن امراؤ نے ضد کی کہ میں پورے سو لوں گی۔ نواب کے پاس خرچ نہ تھا، میرے سامنے صندوقچہ نکال کے کڑے پھینک دیئے تھے۔ (پھر میری طرف مخاطب ہو کے) دیکھنا بہن امراؤ، یہ وہی کڑے ہیں نا؟

میں:۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہو، کیا تم جھوٹ کہو گی۔

بسم اللہ:۔ لے خشکا کھایئے۔ اب یہ کڑے آپ کو نہ دیئے جائیں گے۔ یہ ہمارے نواب کے کڑے ہیں۔ ہم نے پہچانے۔ اب ہم نہ دیں گے۔

حسنو:۔ لو اچھی کہی! اور وہ روپے جو ہم نے دیئے ہیں؟

بسم اللہ:۔ روپے تم کہاں سے لائے؟ وہ بھی نواب کا مال تھا۔

حسنو:۔ جی سچ! مہاجن سے بیاز و (سودی) نہ لا کے دیئے تھے؟

بسم اللہ:۔ اچھا تو مہاجن کو بھیج دیجئے، ہم اس کو روپے دے دیں گے، آپ ٹہلئے۔

حسنو:۔ کڑے تو میں لے کے جاؤں گا۔

بسم اللہ:۔ میں تو نہ دوں گی۔

حسنو:۔ تو کچھ زبردستی ہے؟

بسم اللہ:۔ جی ہاں زبردستی ہے۔ لے اب چپکے سے کھسک جایئے، نہیں تو۔۔۔۔

حسنو:۔ اچھا تو رہنے دیجئے، کل ہی دے دیجئے گا۔

بسم اللہ:۔ کل دیکھا جائے گا۔

kitaabiyat.pk

"دیکھا جائے گا" بسم اللہ نے اس تیور سے کہا کہ میاں حسنو کو چپکے سے اٹھ کے چلے جاتے ہی بن پڑی۔ بات یہ تھی کہ نواب صاحب کے چچا نے جب چھبن صاحب کے نوکروں سے حساب فہمی کی ہے اس وقت جس قدر اسباب جس جس کی معرفت دیا تھا، اس کو سود اور اصل کے روپے دے کے چھڑا لیا۔ حسنو سے اس کڑے کی جوڑی کے لئے جب باز پرس کی گئی تو صاف مکر گیا کہ میری معرفت گروی نہیں ہوئے۔ اسی سے میاں حسنو کی کور دبتی تھی۔

بسم اللہ:۔ (حسنو کے چلے جانے کے بعد مجھ سے) دیکھا بہن، یہ بڑا قابو چی ہے۔ نواب کا گھر اسی موذی نے تہس نہس کیا ہے۔ میں مدت سے اس موئے کی تاک میں تھی۔ آج ہی تو داؤں پر چڑھا ہے۔ یہ کڑے میں اس کو کب دیتی ہوں۔ کر ہی کیا سکتا ہے۔ چوری کا تو مال ہے۔

میں:۔ ہرگز نہ دینا۔ دینا ہے تو نواب کو دے دو، احسان ہو گا۔

بسم اللہ:۔ نواب کو بھی نہ دوں گی۔ بہن گیارہ سو کی جوڑی ہے، موئے نے سوا دو سو روپے پر ہتھیالی تھی، زیادہ بریں نیست۔ سوا دو سو حوالے کروں گی۔ دس بیس سود کے سہی۔

میں:۔ بھلا مہاجن تمہیں کیوں دینے لگا؟

بسم اللہ:۔ کیسا مہاجن! اسی نے روپے دیئے تھے، اور جب بڑے نواب نے پوچھا تو کیسا مکر گیا۔ اگر یہ کچھ زیادہ ٹرپھس کریں گے تو ان کو کوتوالی کا چبوترہ دکھاؤں گی۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ نواب صاحب تشریف لائے۔ پا پیادہ، اکیلے، چہرے پر اداسی چھائی ہوئی، آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے۔ نہ وہ شان و شوکت، نہ وہ رعب داب، نہ وہ بے تکلفی۔ چپکے آ کے اک کنارے بیٹھ رہے۔ سچ کہوں، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، مگر میں نے اپنے کو روکا۔ مگر واہ ری بسم اللہ! رنڈی ہو تو ایسی ہو۔ آتے کے ساتھ ہی کڑوں کا قصہ چھیڑ دیا۔

بسم اللہ:۔ نواب! دیکھو یہ وہی کڑے کی جوڑی ہے نا جو تم نے اس دن حسنو کو گروی کرنے کو دی تھی؟

نواب:۔ وہی ہیں۔ وہ تو مکر گیا تھا کہ میرے ہاتھوں گروی ہی نہیں ہوئے؟

بسم اللہ:۔ کتنے پر گروی ہوئے تھے؟

نواب:۔ یہ تو یاد نہیں، شاید ڈھائی سو یا سوا دو سو، کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ:۔ اور سود کیا تھا؟

نواب:۔ سود کا حساب کس نے آج تک کیا۔ جو چیز گردی ہوئی، پھر اس کے چھڑانے کی نوبت نہیں آئی جو سود کا حساب کیا ہوتا۔

بسم اللہ:۔ اچھا تو یہ کڑے میں لے لوں؟

نواب:۔ لے لو۔

بسم اللہ:۔ کہو تو میاں حسنو کو مرزا صاحب کے پاس بھیجوں؟

نواب:۔ نہیں، میرے سر کی قسم! ایسا نہ کرنا، سید ہے۔

بسم اللہ:۔ سید ہے؟ اس کے باپ کا پتا نہیں؟

نواب:۔ خیر وہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے۔

میں اپنے دل میں نواب کی ہمت پر آفرین کرنے لگی۔ واہ ری ہمت، کیا کہنا، خاندانی رئیس ہیں نا!

بسم اللہ کی بے مروتی دیکھئے، نواب سے وہی چھٹن جان کے گھر جانے کا بہانہ کر کے ان کو سویرے سے رخصت کر دیا۔ خدا جانے کس سے وعدہ تھا۔ اس واقعے کے دوسرے یا تیسرے دن کا ذکر ہے، میں خانم کے پاس بیٹھی ہوں۔ اتنے میں ایک بوڑھی سی عورت آئی، خانم صاحب کو جھک کے سلام کیا۔ خانم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے بیٹھ گئی۔

خانم:۔ کہاں سے آئی ہو؟

بڑھیا:۔ کیا بتاؤں کہاں سے آئی ہوں۔ کوئی ہے تو نہیں؟

خانم:۔ ہوا یہاں کون ہے، میں ہوں اور تم ہو اور یہ چھوکری ہے۔ اس کو بات سمجھنے کی تمیز نہیں، کہو۔

بڑھیا:۔ مجھے نواب فخر النساء بیگم صاحب نے بھیجا ہے۔

خانم:۔ کون فخر النساء بیگم صاحب؟

بڑھیا:۔ اے لو تم نہیں جانتیں، نواب چھبن صاحب ----

خانم:۔ سمجھی، کہو۔

بڑھیا:۔ بیگم صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ بسم اللہ جان کی ماں ہیں نا؟

خانم:۔ ہاں، بات کہو۔

بڑھیا:۔ بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھبن صاحب میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں بھی اس پر پروانہ ہوں

اور اس کا باپ بھی پروانہ تھا۔ میرے نازوں کا پالا ہے اور اس کا چچا بھی دشمن نہیں ہے، اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھتا ہے۔ اس کے بھی ایک اکلوتی لڑکی ہے، بچپن کی منگیتر۔ لڑکی پر گالی چڑھ چکی ہے۔ چھبن نے شادی کرنے سے انکار کر دیا، اسی پر چچا کو برا معلوم ہوا۔ میں نے بھی دخل نہیں دیا۔ یہ سب تنبیہہ کے لئے کیا گیا ہے۔ تمہاری لڑکی کا عمر بھر کا گھر ہے۔ جو تنخواہ لڑکا دیتا تھا، اس سے دس اوپر مجھ سے لینا مگر اتنا احسان مجھ پر کرو کہ شادی پر راضی کر دو۔ شادی کے بعد سب جائیداد اسی کی ہے۔ سوا اس کے اور ہے کون۔ میری اور چچا کی جان و مال کا مالک ہے۔ مگر اتنا خیال رکھو کہ یہ گھر تباہ نہ ہونے پائے۔ اس میں تمہارا بھی بھلا ہے اور ہمارا بھی۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔

خانم:۔ بیگم صاحب کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا اور عرض کرنا کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے، خدا چاہے تو وہی ہو گا۔ میں آپ کی عمر بھر کی لونڈی ہوں، مجھ سے کوئی امر خلاف نہ ہو گا، خاطر جمع رکھئے۔

بڑھیا:۔ مگر بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھبن کو اس کی خبر نہ ہو۔ بڑا ضدی لڑکا ہے۔ اگر کہیں معلوم ہو گیا تو ہرگز نہ مانے گا۔

خانم:۔ (ماما سے) کیا مجال! (مجھ سے) دیکھو چھوکری کہیں کسی سے یہ قصہ نہ لے بیٹھنا۔

میں:۔ جی نہیں۔

اس کے بعد بڑھیا نے علیحدہ لے جا کے خانم سے چپکے چپکے باتیں کیں، وہ میں نے نہیں سنیں۔ ماما کے رخصت کے وقت خانم کو اتنا کہتے سنا۔

خانم:۔ میری طرف سے عرض کرنا کہ اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو قدیمی نمک خوار ہیں۔

بڑھیا کے جانے کے بعد خانم نے بسم اللہ کو بلا بھیجا اور کچھ ایسے دو انچھر کان میں پھونک دیئے کہ اب جو نواب صاحب آئے تو وہ آؤ بھگت ہوئی کہ ملازمت کے زمانے میں نہ ہوئی تھی۔

نواب صاحب بیٹھے ہیں، بسم اللہ سے اختلاط کی باتیں ہو رہی ہیں، میں بھی موجود ہوں۔ اتنے میں خانم صاحب خود بسم اللہ کے کمرے کے دروازے پر آ کے کھڑی ہوئیں۔

خانم:۔ اے لوگو ہم بھی آدیں؟